



SUGAR  
IS  
BAD!

# وفاقی سائنس دان



## فہرست

صحت

۱. .... سائنٹ کٹر  
۲. .... نئی زندگی

ادب و مزاح

۳. .... اکرم سہیل اور عصری تاریخ

سچی کہانیاں

۵. .... ہمارا گھر مندر بن گیا تھا

معاشرہ اور ثقافت

۷. .... اپریل فول ، جھوٹ کا عالمی دن !  
۹. .... لاہور ایک قدیم شہر  
۱۰. .... مدر ڈے
-

## سائنٹ کلر

مصنف: یوسف

جرمن ماہر ڈاکٹر لوزل کا کہنا ہے جرمنی میں پانچ لاکھ افراد اس بیماری کے ابتدائی علاج کے دور سے گزر رہے ہیں جبکہ ایک لاکھ مبتلا ہونے کے بعد زیر علاج ہیں نتائج آنے میں وقت درکار ہوگا۔ طبی رپورٹ کے مطابق ان افراد کے پیٹ کی خاص رگ پانچ سینٹی میٹر تک پھولی ہوئی اور سوجن ہے جس کے سبب وہ کسی بھی وقت پھٹ سکتی ہے اور ایسے مریضوں کا فوری آپریشن لازمی قرار دیا ہے تاہم کچھ مریضوں کا علاج تشخیص کے بعد شروع کیا جائے گا، لڑا ساؤنڈ سکین سے ڈاکٹروں نے اس بیماری کا پتہ لگایا ہے لیکن جرمنی میں صحت سے منسلک ادارے سکریننگ کرنے کی ڈاکٹروں کو ادائیگی نہیں کرتے اسلئے کئی مریضوں کو خود ادائیگی کرنا ہوتی ہے جو ایک مہنگا علاج ہوتا ہے تاہم روٹین چیکنگ کے دوران اتفاق سے بذریعہ لڑا ساؤنڈ اگر معلوم ہو جائے کہ مریض اس بیماری میں مبتلا ہے تو اسکی ادائیگی صحت کا ادارہ کرتا ہے روٹین چیکنگ میں پیٹ کا لڑا ساؤنڈ یا گردے کی تکلیف سے مراد ہے۔ فیملی ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ پینٹھ برس سے زائد افراد کو باقاعدگی سے لڑا ساؤنڈ کروانا چاہئے اور خاص طور سے ان افراد کیلئے زیادہ اہم ہے جو موٹاپے میں مبتلا ہیں یا ذیابیطس ہونے اور بکثرت تمباکو نوشی کرتے ہیں یا کمر کے درد کی شکایت کرتے ہیں۔ پیٹ کے اندرونی نظام میں اکثر معمولی انفیکشن سے بھی اس بیماری میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے کیونکہ انفیکشن کی صورت میں رگیں اکثر زیادہ پھول جاتی ہیں یا اتنی کمزور اور باریک ہو جاتی ہیں کہ پھٹ سکتی ہیں اور خون جاری ہونے کی صورت میں فوری موت بھی واقع ہو سکتی ہے، زیادہ تر مرد اس بیماری میں مبتلا ہیں کیونکہ مردوں کی روزمرہ زندگی گزارنے کا طریقہ خواتین سے مختلف ہوتا ہے مثلاً حفظان صحت پر زیادہ توجہ نہ دینا وغیرہ۔ لڑا ساؤنڈ سے فوٹوز حاصل کرنے کے بعد دوسرا قدم کمپیوٹر ٹومو گرافی سے مطلوبہ رگ کا پتہ لگانے کے بعد آپریشن لازمی ہوتا ہے، پیٹ چاک کرنے کے بعد زخمی رگ کے ساتھ مصنوعی عضو کیمپس لگا دی جاتی ہے جس سے خون کی سرکولیشن جاری رہتی ہے اور پوزیشن تبدیل کر دی جاتی ہے، سنٹینٹ گرافٹ کا استعمال کرتے ہوئے اینڈو ویس کیو لری کو مبی نیشن سے رگوں کو مضبوط کیا جاتا ہے اور مریض تین سے سات دنوں میں فٹ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوزل کے مطالعے اور دستاویزی مواد کے پیش نظر ایک سو چوالیس افراد کے سنٹینٹ گرافٹ آپریشن ہوئے اور دو ہزار پندرہ میں اطالوی میگزین دی ایٹالین جرنل آف ویسکولر اینڈوویس کیولر سرجری کے عنوان سے شائع ہوئے جس میں تصدیق کی گئی کہ یہ ہی سائنٹ کلر کا کامیاب علاج ہے۔

§§§

یہ کسی فلم یا لیبٹ کا نام نہیں بلکہ دنیا بھر میں کئی انسان اس خاموش قاتل کے شکار ہیں یہ قاتل انسان کے وجود میں آنے کے بعد اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے انحصار اس بات پر بھی کرتا ہے کہ انسان کس خطے یا ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے روزمرہ کی مصروفیات کیا ہیں، کیا معقول اور صحت مند غذاؤں کا استعمال کیا جا رہا ہے، مکمل نیند لیتا ہے، اور کس شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ دنیا میں پچھلی بیماریاں قدیم ہونے کے ساتھ آج کل سائنس کی طرح ترقی بھی کر رہی ہیں سائنس ماہرین جتنا ان بیماریوں کی تہہ یا جڑوں میں جا کر ان کا مطالعہ اور مقابلہ کرتے ہوئے علاج کے طریقے دریافت کر رہے ہیں اتنی ہی تیزی سے کئی بیماریاں انسانوں کی اپنی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی سے جنم لے رہی ہیں اور روز بروز کئی نئی بیماریاں کا شکار ہو کر انسان موت کے منہ میں جا رہے ہیں، کسی نے زیادہ کھا لیا تو بیمار ہو گیا کم کھا یا تو بیمار، زیادہ خواب و خرگوش کے مزے لیتا رہا تو بیمار نیند پوری نہیں ہوئی تو بیمار یہ کہنا مناسب ہو گا کہ انسان کچھ کرے یا نہ کرے بیمار ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ البرٹ آئین سٹائن معمولی لیکن خطرناک حد تک پیٹ کی موٹی رگ کے پھیل اور سوج جانے سے موت کا شکار ہوا تھا۔ کئی بیماریوں کی اردو میں ٹرانسلیشن کرنا ناممکن ہونے کے ساتھ اردو میں لکھنا نہایت دشوار ہوتا ہے اور اگر حرف بہ حرف درست طریقے سے یعنی ججے کر کے نہ لکھا جائے تو مطالعہ کرنے میں دقت پیش آتی ہے تاہم ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ انگریزی کے حروف کی درست اور صحیح الفاظ میں بامعنی لکھنے کے ساتھ ساتھ مختصر تشریح بھی کروں اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا ہوں اس کالم میں بھی کچھ ایسے پیچیدہ طبی الفاظ شامل ہیں جنہیں اردو رسم الخط میں تحریر کرنے میں کافی محنت کی ہے تاکہ دوران مطالعہ آسانی رہے۔ حالیہ طبی رپورٹ کے مطابق پیٹ کے اندر پلٹے والی قدیم بیماری کا واضح طور سے مطالعہ کیا گیا جس کے نتائج منفی ظاہر ہوئے ہیں، جرمن ماہرین کا کہنا ہے صرف جرمنی میں پینٹھ برس سے زائد کے افراد جن کی تعداد پانچ لاکھ ہے اس بیماری میں مبتلا ہیں، پیٹ کی اس بیماری کو کسی بھی زبان میں ادا کرنا نہایت مشکل ہے جبکہ مکمل جانکاری حاصل کرنا اور زیادہ مشکل۔ اینڈو میٹل اینیو رسم جسے آؤرنک اینیو رسم بھی کہا جاتا ہے ایک مہلک اور جان لیوا بیماری ہے۔ زیادہ تر افراد اسکی علامات اور اثرات سے واقف نہیں کیونکہ یہ خاموشی سے جسم اور خاص طور پر پیٹ میں نہایت خاموشی سے پروان چڑھتی ہے اور اسی لئے اسے خاموش قاتل یعنی سائنٹ کلر کہا جاتا ہے۔





۲۰ جنوری کو گیارہ بجے کلاس سے فارغ ہو کر گھر میں بات چیت ہو رہی تھی کہ پیٹ درد ملکی ملکی شروع ہو گئی، مقامی ڈاکٹر سے دوائی لی مگر آرام نہ آیا شام ۷ بجے اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا تو انہوں نے میو ہسپتال بھیج دیا کہ منسلکین ہے ساتھ اپنے لیٹر پیڈ پر ہسپتال کے ڈاکٹر کو کچھ ٹیٹ کرنے کا بھی کہا۔ ٹیٹ کئے تو جگر کا منسلک سامنے آیا کچھ آرام آنے کے بعد ہسپتال والوں نے گھر بھیج دیا اگلے دن طبیعت مزید خراب ہو گئی شام فیملی ڈاکٹر کے پاس گیا تو انہوں نے پھر میو ہسپتال، میں اپنے نیگزین کے ساتھی علی رضا کے ساتھ ہسپتال چلا گیا انہوں نے عارضی علاج کر کے آج پھر مجھے گھر بھیج دیا۔ اتوار کو طبیعت کچھ ٹھیک رہی پیر کو شام کو طبیعت سخت خراب ہو گئی فیملی ڈاکٹر کے پاس پہنچا تو انہوں نے سب مریضوں کو چھوڑ کر مجھے چیک کیا تو انہوں نے کہا کہ ہسپتال والے آپ کو داخل کیوں نہیں کرتے؟ آپ کی طبیعت سخت خراب ہے۔ آپ کو کوئی سنگین منسلک درپیش ہے۔ آپ فوری ہسپتال جائیں پھر انہوں نے اپنے لیٹر پیڈ پر سرکاری مہر کے ساتھ ہسپتال کے ڈاکٹر کو کچھ ہدایات یا آراء لکھ کر مجھے دیں۔ ہم ہسپتال پہنچ گئے ساتھ ہی ماموں ملک محمود الحسن، سرفراز، حق نواز، ملک، قدیر بھی ہسپتال آ گئے۔ ہسپتال ایمرجنسی میں میڈیکل اور سرجری شعبہ جات کے ڈاکٹر اس بحث میں الجھ گئے کہ یہ ہمارا مریض نہیں ہے۔ مجھے ساتھی میڈیکل والوں کے پاس لے کر جاتے تو وہ کہتے کہ سرجری والوں کے پاس جاؤ سرجری والوں کے پاس جاتے تو وہ کہتے کہ میڈیکل والوں کے پاس جاؤ۔ صورت حال کو دیکھتے ہوئے ملک محمود الحسن ان لیگ لاہور کے جوائنٹ سیکرٹری نے بلال یاسین ایم این اے کو فون کیا کہ ہمارے مریض کو ایمرجنسی میں علاج کی سہولت میسر نہیں بلال یاسین نے ہسپتال فون کیا تو علاج شروع ہو گیا مجھے ۱۰۴ بخار تھا اپنی حالت سے بھی لاعلم تھا ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی کے آخری سانس چل رہے ہیں زبان پر کلمہ طیبہ جاری ہو گیا۔ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اپنے خالق حقیقی کو کچھ دیر بعد ملنے والا ہوں۔۔۔۔۔ رات کا بیٹ چکی تھی وقت دیکھنا یا پوچھنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اپنے آپ کا علم بھی نہ تھا اور یہ بھی علم نہ تھا کہ کہاں ہوں؟ ایک وقت ایسا آیا کہ حق نواز بھائی کو دیکھا جو پاس کھڑا انتہائی پریشان تھا مگر شدید بیماری کے باعث اس سے بھی بات نہیں کر سکتا تھا۔

علاج کرتے کرتے دن کی روشنی نمودار ہو گئی مگر مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔ مجھے بیڈ سے اٹھا کر کہیں لیجانے کیلئے سٹریچر پر ڈالا گیا

لفٹ کے ذریعے بالائی منزل سے نیچے لایا گیا جب امیر جنسی سے باہر لایا گیا تو پھرے پر بارش کے کچھ قطرات پڑے تو احساس ہوا کہ مجھے کہیں اور لیجا یا جا رہا ہے ایبونیسن میں رکھا گیا تو سمجھا شلڈ کسی اور ہسپتال میں شفٹ کیا جا رہا ہے میرا علاج کرنا میو ہسپتال والوں کے بس میں نہیں ہے۔ ایبونیسن نے پانچ منٹ کے بعد کہیں اتارا وہاں سے مجھے کہیں میں منتقل کیا گیا۔ اس وقت تو علم نہ ہو سکا کہ میں کہاں آگیا ہوں البتہ چار پانچ گھنٹوں کے بعد جب کچھ حالت سنبھلی تو پتہ چلا کہ میو ہسپتال کی گوجرانوالہ وارڈ (ایسٹ سرجیکل وارڈ) میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔ یہ ۲۴ جنوری ۲۰۱۷ء منگل کا دن تھا۔ ہر روز ڈاکٹرز صبح کو راونڈ کرتے چیک کر کے چلے جاتے، ٹیٹوں کو روزانہ کی بنیاد پر کیا جانے لگا ایک دن وارڈ کے ہیڈ ڈاکٹر امیر افضل راونڈ کرتے ہوئے میرے پاس آئے تو انہوں نے کہا کہ اس حالت میں بغیر تشخیص کے جو بھی آپ کا علاج کرے گا وہ خود بھی پریشان ہوگا اور تمہیں بھی پریشان کرے گا۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ تشخیص کیلئے بتائیں کہ ہم کیا کریں انہوں نے کہا کہ آپ M.R.C.P اور P.E.R.C.P. کروائیں پھر ہم کسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے، میں نے استفسار کیا کہ میو ہسپتال سے یہ ٹیسٹ ہو جائیں گے تو ڈاکٹر امیر افضل نے بتایا کہ میو ہسپتال سے یہ ٹیسٹ نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں پر ان کی سہولت میسر نہیں ہے یہ سن کر میں حیران رہ گیا کہ ایشیاء کے سب سے بڑے ہسپتال میں ان ٹیٹوں کی سہولت موجود نہیں یہ ٹیسٹ تو انتہائی اہم ہیں ان کی سہولت تو ہر سرکاری ہسپتال میں ہونی چاہیے یہ سہولت نہ ہونے کے باعث مریض تو بہت ذلیل و رسوا ہوتے ہوں گے حکومت کو چاہیے کہ ان ٹیٹوں کی سہولتوں ملک بھر کے تمام سرکاری ہسپتالوں میں فراہم کرے۔

M.R.C.P تو گنگ رام ہسپتال سے جلد ہی ہو گئی مگر E.R.C.P کروانا ہمارے لئے مشکل ترین کام ہو گیا کیونکہ اس ٹیسٹ کیلئے جس سرکاری ہسپتال سے رابطہ کرتے تین ماہ دو ماہ، پندرہ کا ٹائم ملتا۔ اتنی دیر انتظار کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ ۱۰۳ بجار دن میں دو سے تین بار ضرور ہوتا تھا جس سے حالت انتہائی خراب حد تک پہنچ چکی تھی۔ حالت کو مد نظر رکھتے ہوئے مخلص ساتھیوں ڈاکٹر نجم الدین اور بریگیڈیئر (ر) محمد حنیف صاحب نے سی ایم ایچ سے ای۔آر۔سی۔بی کروانے کا فیصلہ کر لیا دو دن میں ہی یہ ٹیسٹ اللہ کی توفیق اور مدد سے ہو گیا۔ سی ایم ایچ کے ڈاکٹر نے چھوٹی پتھریاں نکال دیں ایک بڑی پتھری رہ گئی جو آپریشن سے ہی نکل سکتی تھی۔

دونوں ٹیٹوں سے جو شخصیں ہوئی وہ یہ تھی کہ جگر کے باہر ایک تھیلی بن گئی ہے اور سی-بی-ڈی میں پتھری ہے اور آنتوں میں ہوا بھری ہوئی ہے۔ ۱۶ جنوری کو آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا حسب معمول اسی دن آپریشن ہو گیا یہ آپریشن ڈاکٹر امیر افضل صاحب نے پوری محنت توجہ اور پیشہ وارانہ

تجربے سے کیا۔ حالت نازک ہونے کے باعث آئی سی یو میں شفٹ کیا گیا جہاں چھ دن تک زیر علاج رہا۔ پھر باہر شفٹ کر دیا گیا آپریشن کے بعد ڈاکٹر وزیر حسن جیسا نرم دل، صحتی معالج ملا جنھوں نے شب وروز ایک کر دیئے بھر پور توجہ دی ڈاکٹر ذیشان سرور، ڈاکٹر کاشف، ڈاکٹر حنیف کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا رنگ سٹاف میں سے نکلیں بھائی اور دیگر نرسز کی شبانہ روز محنت نے علاج میں اہم کردار ادا کیا۔ چار دن وارڈ میں رہنے کے بعد ۲۵ جنوری کو ڈسچارج کر دیا گیا مگر ڈرین اور ٹی ٹیوب نہیں نکالی کیوں کہ ڈاکٹر امیر افضل نے ڈاکٹر کو کہا تھا کہ اس مریض کی یہ دونوں نالیاں لگی رہنے دیں جب تک ریڈیالوجی کی رپورٹ نہیں آجاتی۔

ریڈیالوجی کی رپورٹ کے بعد آپریشن تھینر میں بلوایا گیا جہاں ڈاکٹرز نے رپورٹ کا مطالعہ کیا تو انھوں نے کہا کہ ابھی دو پتھریاں مزید ہیں صبح وارڈ میں آئیں اگلے دن وارڈ میں گیا تو ڈاکٹر امیر افضل نے رپورٹ دیکھی تو کہا کہ یہ رپورٹ بتا رہی ہے کہ پتھریاں نہیں ہیں جن کو پتھریاں کہا جا رہا ہے وہ درحقیقت پتھریاں نہیں ہیں۔ باقی نالیاں بھی نکال دی گئیں چونکہ گھنے وارڈ میں ٹھہرنے کا کہا اگلی صبح راولپنڈی کے دوران مختصر ملاقات کے بعد گھر بھیج دیا گیا۔ چند دن کے بعد فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر عدنان سرور سے ملاقات کی تو انھوں نے ایک تجربہ کار ڈاکٹر کے پاس الٹراساؤنڈ کیلئے ریفر کیا۔ الٹراساؤنڈ کیا گیا تو رپورٹ وہی تھی جو ڈاکٹر امیر افضل نے کہا تھا۔ علاج کے دوران یہ بات خاص طور پر نوٹ کی گئی کہ چھوٹے درجے کے عملہ کی تربیت کا شدید فقدان ہے۔ وارڈز میں لواحقین کے بیٹھنے کیلئے ڈیک پرانے خستہ حال بیڈز اور گدے عوامی خدمت کی دعوے دار حکومت کو منہ چڑھا رہے تھے۔ علاج کے دوران اسلامی اخوت و مواصلات کا عظیم مظہر دیکھنے کو ملا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام احباب کی حفاظت فرمائے جنھوں نے بیماری کے دوران راقم کے ساتھ کسی قسم کا بھی تعاون کیا۔

§§§

## اکرم سہیل اور عصری تاریخ

مصنف: یوسف

کہتے ہیں کہ ایک بار اشرف صہجی کسی کام سے حفیظ جالندھری کے گھر گئے۔ وہاں انہوں نے حفیظ جالندھری سے کوئی کتاب طلب کی جو کسی الماری میں تالا بند تھی۔ حفیظ جالندھری صاحب نے پیٹھے پیٹھے ہانک لگائی۔۔۔ پیگم ذرا چابی دینا، ایک کتاب نکالنی ہے۔ اس پر صہجی چپک کر بولے "ہاں ہاں ضرور چابی دیجیے یہ بھی اب چابی کھلونا بن گئے ہیں۔ چابی کے بغیر چل نہیں سکتے"

یہ تو گئے زمانوں کی بات ہے جب ٹیکنالوجی ذرا کم ترقی یافتہ تھی اور ان دنوں مارکیٹ پر جاپان چھایا ہوا تھا۔ اب معاملہ ذرا اور آگے بڑھ گیا ہے۔ ایک طرف چین کا سایہ ہے تو دوسری طرف ریوٹ کا دور دورہ۔ اسلئے اب ہمیں ہم تم کرے میں بند ہوں اور چابی کھو دیں جیسے گیت سننے کو نہیں ملتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اب "ٹچ" سسٹم چل رہا ہے۔ سو اب "ٹچ می ناٹ" بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں تو صہجی کا ٹھٹھا اپنی جگہ مگر یہ حقیقت ہے کہ اب عمومی طور پر سوچ و عمل کے باب میں کچھ ایسے ہو گئے ہیں کہ صاف نظر آتا ہے کہ ریوٹ کہیں اور ہے حرکت کہیں اور۔۔۔ اس بے حس و جامد کیفیت میں کچھ فرزانے بلکہ دیوانے ایسے ہوتے ہیں جو "کل جاسم سم" کا اسم اعظم الاپتے سناتے دوڑتے بھاگتے پھرتے ہیں۔ کہ شاید کہیں کوئی جنبش ہو اور کوئی روک بندش کھلے۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ جو کہنے کو کئی سال بیوروکریسی میں گزارا بلکہ گنوا کر آیا ہے۔ لیکن ایسا کلاما "نیا" کہ برسوں پہلے دیکھے خواب سنبھالے پھرتا ہے۔ اسے گمان ہے کہ اس کے خواب نئے اجالوں کے سفیر ہیں۔ اس کا گمان وقت کے ساتھ ساتھ ایقان میں بدلا سو وہ کہنے کے قابل ہوا۔

میں وہ جانتا ہوں حقیقتیں جو اس ارض بے نوا کی ہیں گر دل میں رکھ کے ہی سو گیا تمہیں کون پھر یہ بتائے گا اس نے اپنے خوابوں کا انتساب کچھ ایسا کیا کہ سب ظاہر باہر ہو گیا۔ مشہور پہاڑی آخان ہے کہ "ہمنیاں ناں بالا نیدی اے اپنا" اس کی فکر و شاعری کے باب میں یہ آخان مکمل طور پر صادق آتا ہے کہ اس کا حرف لفظ لفظ اس کی سوچ کا آئینہ دار ہے۔

وہ "حمہ" لکھتا ہے تو کہتا ہے کسی نے لو جو لگائی تو اس کو دار ملی کہیں تو نوک سناں تن کے آر پار ملی وہ تیرے نام کا صدقہ اتارنے کے لئے دیا تھا دل تو چلے جان وارنے کے لئے اور "نعت" کہے تو یوں گویا ہوتا ہے۔ قاطع عہد غلامی وہ بشیر اور نذیر عہد ظلمات میں وہ شمس الضحیٰ کی تنویر ظلم کا ہاتھ جھٹک دینے کی توفیق ملی بند سوچوں کو بھی پھر جرات تحقیق ملی غالباً

اسی متبرک سوتے سے تحقیق و تخلیق کی جرات پا کر جب وہ آگے بڑھتا ہے تو اس کا اسم اعظم کام کر جاتا ہے۔ وہ کل جا سم سم کہتا ہے تو ملکی حالات، تاریخ، تحریک اور سیاست کے بند در اس کے سامنے کچھ یوں داہوتے ہیں کہ وہ سات پردوں میں ہونے والے معاملات کو بھی دیکھ سمجھ لیتا ہے۔ اس کی پرکھ کی یہ صلاحیت دیکھ کر کبھی کبھی وہ مجھے "حکلیت" کے صابر راجپوت کی کہانیوں کا "کھوجی" لگتا ہے جو کھرا اٹھتا ہے، تو ملکی وسائل لوٹنے والوں کے گھر تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سمجھ بوجھ کو جب اپنی اہلیت اور فنی ریاضت کے سہارے شاعری کا چیر ہن پہناتا ہے تو وہ سنور کھڑ کر یوں سامنے آجاتا ہے کہ سیاہ اندھیرے میں چاندنی سی چمک چمک بن جاتی ہے۔

وہ فکری طور پر راسخ ہے سو اسے کر بلا حریت کا استعارہ لگتا ہے اور اسے یہ جرات بھی حاصل ہے کہ وہ فیض سے پوچھ پائے کہ "کب راج کرے کی خلق خدا" حریت اور فیض کا تذکرہ آیا تو یہ کہنا حق بنتا ہے کہ وہ ترقی پسند فکر کا حامل شخص و شاعر ہے اسی لئے اس کی شاعری میں مزاحمت کا عنصر بہت واضح ہے اور وہ جرات و ہمت کو رہبر کر کے خلق خدا کی حالت بدلنے کی آس رکھتا ہے۔ وہ شہر کے قلم کاروں کو حرمت لفظ کا اٹن بتاتا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ "جی روح اوہے جے فرشتے" یعنی جیسا تو ویسے حکمران باہ۔

! ائن انشا کہنا ہے کہ حق اچھا پر اس کے لئے کوئی اور مرے تو اور اچھا سو ہم بحیثیت مجموعی وہ محتاط و منافع لوگ ہیں جو ہر سو ظلم کی پلاشتاں دیکھ کر اسے غلط تک کہنے سوچنے سے بھی گریزاں ہیں کہ مبادا یوں نہ ہو جائے مبادا وہ نہ ہو جائے۔ اس کی شاعری کا مطالعہ بتایا ہے کہ وہ اس "احتیاط" سے ممکنہ طور پر بچا رہا ہے۔ اور اس کی یہ عادت اس کی فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ لہذا اس کا لکھا حرف حرف لفظ لفظ، شعر، نظم، قطعہ، غزل سبھی کچھ ایک خاص فکر کا غماز ہے۔ وہ اب برائے زندگی کا قائل بلکہ اس سے گھماں ہے۔ سو اس کے سارے موضوعات زندگی بلکہ کرب انگیز زندگی سے کشید ہوئے ہیں۔ اسلئے اس کی شاعری میں صداقت بھی ہے اور بغاوت بھی۔ وہ جانتا ہے کہ "حکم شامی" یوں ہی ملتا ہے۔

حکم شامی ہے مرا جشن منایا جائے میرے ارمانوں کا ایک تخت بچھایا جائے میرے احکام کی تعمیل مگر ہو ایسے سی سختی کسی کاغذ پہ نہ لایا جائے ایسی ہستی کہ جہاں لوگ ہوں گستاخ بہت ایسا گھر کوچ و بازار جلایا جائے \* وہ بھی کچھ ایسا ہی "گستاخ" ہے مگر اس نے ہر بات نہایت سبوت پنے سے کہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی فکر عمومی طور پر اس کے بیان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔

یوں تو "نئے اجالے ہیں خواب میرے"۔ دس حصوں پر مشتمل ہے اور اس کے تمام حصے ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ اس کا موضوع مظلوم ملک و لوگ ہیں اور مظلوموں

کے درد سانچے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان فطری اتحاد ہونا بھی لازمی امر ہے لیکن اس کے دو خصوصی حصے جو کشمیریات یعنی کشمیر کی تحریک آزادی اور یہاں کے قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ کا احوال بیان کرتے ہیں، خاصے کی چیز ہیں۔

کہتے ہیں کہ افغانستان کے جہاد اور روس کے سقوط کا اصل سبب کسٹین میں پایا جانے والا سنہری سیال ہے۔ اس طرح ماہرین کہتے ہیں کہ دنیا میں آئندہ جنگیں پانیوں پر ہوں گی۔ ان دو حوالوں کو ذہن میں رکھ کر دیکھا جائے تو گزشتہ کئی سالوں سے کشمیر کی مایلوں اور نالوں پر قبضے کا ایک خاموش عمل آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ عمل وہ ہے جسے اس نے "وائر لائڈرنگ" کا نام دیا ہے۔ اس نے پہلی بار اس اہم اور بے حد حساس معاملے کو دیکھا اس پر سوچا اور پھر پوری جرات سے لکھا۔ یوں مجھے اس کی شاعری کشمیر کی عصری تاریخ معلوم ہوتی ہے۔ اس عصری تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو مجھے شعوری طور پر یہ عمل ایک نئے کشمیر کی دریافت لگتا ہے۔

اکرم سہیل کی شاعری میں نظم و قطعے کا پلا ذرا بھاری ہے۔ اس کی نظم ہنگامی و موضوعاتی نوعیت کی ہے۔ یوں وہ مولانا ظفر علی خان کی راہ کا راہی کہلا سکتا ہے۔ لیکن بلند آہنگی اور پر شکوہ انداز کے باعث اور غالباً فطری میلان میں یکسانیت کے سبب وہ غیر محسوس انداز میں جوش کی پیروی کرتا نظر آتا ہے۔ اس کی نظم و قطعے کا باہم مطالعہ گزشتہ دو تین دہائیوں کی تاریخ کے وہ در واکرتا ہے جو عمومی طور پر ڈاڈے باٹے کر کے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

اپنی طبیعت اور شخصیت میں وہ حلیم و متوازن شخص فیض اور احمد ندیم قاسمی کا مقلد لگتا ہے۔ فیض جو اب برائے زندگی کے قافلے کا سرخیل تھے کہ متعلق کتابوں میں پڑھا اور لوگوں سے سنا ہے کہ وہ علم، حلم اور نظم کا آمیزہ تھے تو اسی طرح رب کی مہربانی سے کھلی آنکھوں سے ندیم کو بار بار دیکھا تو یہ جانا کہ فنی ہنرمندی اور سلیقہ شعاری کیا ہوتا ہے۔ اکرم سہیل شخصی حوالوں سے ان سے متاثر لگتے ہیں لیکن مزاحمتی شاعری میں ان پر غالب ذرا زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔ شاید حالات کی سختی اور تلخی نے ان کے لہجے کو ذرا تند کر دیا ہے، ورنہ یوں تو وہ ریلے ٹیٹھے شخص ہیں۔

اکرم سہیل جب کشمیر کہانی کہتے ہیں تو وہ یہاں کے بہتے پانی کو نہیں بھول پاتے جو ہائڈرل جزیں کی ہنگامی صورت میں دے دیا گیا، اسی لئے ان کا کہنا ہے۔

نالہ صدیوں سے ہے دلگیر میرا جسم بھی پایہ زنجیر میرا جس کے پانی پہ میرا حق ہی نہیں کیسے کشمیر و کشمیر میرا مسئلہ کشمیر پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کیا رخ بھی یہ دیکھا ہے کشمیر کہانی کا باقی ہیں یہ سب نعرے مسئلہ ہے یہ پانی کا یا پھر میری دھرتی کی ایک ہی دولت ہوس زر کا وہی شکار ہوئی کیسے قبضے میں غیر کے آئی یہ حقیقت بھی

آشکار ہوئی اکرم سہیل نے کشمیر کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کو پہلی بار موضوع شاعری بنایا۔ سو وہ کہتے ہیں۔

میرے دریاؤں کی باتیں ، میرے اشجار کی باتیں میرے یا قوت کی باتیں، میرے مرجان کی باتیں جو ہو قومی وسائل لوٹا مقصد ہی جب ان کا کہاں بھاتی ہیں ان کو قاعدہ قانون کی باتیں اکرم سہیل کی شاعری یقیناً کشمیر کے مزاحمتی ادب میں ایک بامعنی اضافہ ہے۔ جس کی گونج نہیں جلت رنگ دور اور دیر تک سنائی دے گی۔ کہ اس میں کشمیر کے بہتے جھرنوں اور گنگناتی ندیوں کا ترنم و الم ہے اور اس کی تاثیر یقیناً گہری اور ڈاڈی ہے۔ کہ یہ دھرتی کے سینے پر رقم وہ تحریر ہے جسے محسوس کئے بنا آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔

§§§

## ہمارا گھر مندر بن گیا تھا

مصنف: یوسف

ایک مضمون دیکھنے کچھ اس طرح لکھا ہے کہ "گھروں سے دریافت ہونے والی عجیب اشیاء کوئی مالا مال تو کوئی خوف سے نڈھال"

اس میں مغربی ممالک میں مختلف گھروں سے پرانے مکینوں کی چھوڑی ہوئی اشیاء کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ آسٹریا میں کسی گھر میں مکین کو ہاتھ روم کی دیوار سے ایک کوریائی میزائل ملا۔ ایک امیر جرمن باشندے کو اپنے گھر کے تہ خانے سے جنگ عظیم کے دور کے ہتھیار ملے جن میں ایک نیک اور توپ بھی شامل تھی۔ اسی طرح ایک دوسرے ملک چیک ری پبلک میں گھر کے اندر کسی کام کے سب کھدائی کی گئی تو کسی گرجا گھر کی چار صد سال پرانی گھنٹی ملی۔

لیکن یہ جرائی کی بات نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی ایسی اشیاء نکلتی رہتی ہیں۔

اور ایسی ہی کچھ اشیاء مجھے ماضی کی وادیوں میں لے جا رہی ہیں۔۔۔ نوشکی۔ بلوچستان کا ایک دور افتادہ مقام ہے جو تقریباً ایران جانے والی شاہ راہ پر واقع ہے۔ یہ قصبہ انگریزوں نے نہایت ہی منصوبہ بندی سے بنایا تھا۔ تمام سڑکیں گلیاں کشادہ اور ایک دوسرے کے سے قائمہ زاویہ بناتی ہوئی ملتی ہیں۔ یہ 1954 - 55 کا زمانہ تھا۔ ہم اسی خوبصورت قصبے میں رہتے تھے۔ مکان کا نمبر بھی ابھی تک یاد ہے۔ یہ 102 تھا۔ انگریزوں نے اپنے لئے ایک ٹینس کورٹ بھی بنایا ہوا تھا۔ جس کے فرش پر ہم خانے بنا کر اسٹاپو وغیرہ کھیل کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل یہاں ہندو کافی تعداد میں تھے کیونکہ ارد گرد کے علاقوں کے لئے یہ ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا اور ہندو اس تجارت کے کرتا دھرتا تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کافی تعداد میں ہندو یہاں سے ہجرت کر کے بھارت چلے گئے تھے لیکن پھر بھی ان کی ایک کافی تعداد رہ گئی تھی۔

ایک دن اباجان مرحوم نے گھر کے صحن میں کیاری بنا کر مختلف پھول لگانے کا ارادہ کیا۔ دروازے کے قریب ہی ایک مناسب جگہ دیکھ کر کھدائی کی۔ ہم بچے بھی اباجان کا ساتھ دے رہے تھے اور مٹی اٹھا اٹھا کر قریب ہی ڈھیر کرتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر نیچے گرا۔ میں چونک گیا کہ پوری مٹی میں پتھر نہیں تھا یہ کہاں سے نکل آیا۔ اسے اٹھایا اور اسے دیکھنے لگا۔ بھائی جان جو قریب ہی کھڑے تھے انہیں بھی تجسس ہوا اور وہ بھی کام چھوڑ کر میرے قریب آگئے اور اسکی مٹی صاف کرنے لگے۔ اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ وہ پتھر نہیں تھا بلکہ ایک گائے کی شکل کا کھلونا تھا۔

میں اس وقت چار پانچ برس کا تھا۔ میں نے تو اسی وقت اس سے کھیلنا شروع کر دیا۔

اباجان مرحوم نے کیاری میں بیج بودے۔ ایک دو پھیریاں بھی اباجان مرحوم نے کہیں سے لا کر لگا دیں۔ ایک دو دن گزر گئے۔ ہم نے گائے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی۔ نہ جانے ہندوؤں کو کیسے اس کا علم ہو گیا۔

غالباً باقی مرحومہ یا بھائی جان میں سے کسی نے اسکول میں میں تذکرہ کیا تھا اور کسی ہم جماعت کو وہ گائے دکھائی بھی تھی۔ اس کے بعد تو ہندو خواتین کا ہمارے گھر تانتا بندھ گیا۔ وہ نہ جانے کیا کیا چیزیں لے کر آئیں، اور اس مقدس پوتر دھرتی جہاں سے لکڑی کی گائے نکلی تھی کے پھیرے لگاتیں۔ پھر کسی نادیدہ ہستی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتیں اور سر نہوڑائے بیٹھ جاتیں۔ دھیمی دھیمی آواز میں کوئی اشوک پڑھتیں۔ اس کیاری کی مٹی کو اپنی انگلی سے چھوتیں اور نہ جانے کیا رسومات کرتیں۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سی گھنٹی ہوتی تھی اسے ہلکی ہلکی آواز میں بجاتی تھیں۔ ان کی کوشش ہوتی کہ جب والدین نہ ہوں اس وقت آئیں اور اپنی رسومات ادا کریں۔ یہ کیا ہو رہا تھا اس کا تو ہم بچوں کو علم نہیں تھا لیکن ان کے آنے سے ہم خوش بہت ہوتے تھے کیوں کہ وہ طرح طرح کی مٹھائیاں، لڈو وغیرہ پیتل کی تھالیوں میں رکھ کے لاتیں اور کیاری کے گرد ان کو لیکر گھومتے اور ہمیں بھی پرشاد ہے کہہ کر دیتی تھیں۔ ہمارا گھر تو ایک قسم کا مندر بن گیا تھا۔ بعد میں امی آئیں تو ہمیں بہت غصہ ہوتی تھیں۔ خیر بعد میں اباجان نے وہ گائے وہاں کے ایک معتبر ہندو کو دے دی تھی۔ ہندو اس مقام سے بہت سی مٹی بھی کھود کر لے گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ پوتر مٹی ہے۔ اس کے بدلے میں ہندوؤں نے کہیں اور سے مٹی لا کر ڈال دی تھی۔

اس طرح کا ایک قصہ ابن صفی (مشہور جاسوسی ناول نگار۔۔۔ عمران فریدی اور کیپٹن حمید کے کرداروں کے خالق) کے فرزند جناب احمد صفی بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ راولپنڈی میں نانا ابو کو جو گھر فوج کی طرف سے الاٹ ہوا وہ اس سے قبل کسی ہندو خاندان کا تھا جو ہجرت کر گیا تھا۔ والدہ مرحومہ نے بتایا کہ ایک کمرے کی دیوار دھری بنی ہوئی تھی اور اس پر ہاتھ مارتے تو جیسے برتنوں کے جھنجھٹانے کی آواز آتی تھی۔۔۔ نانا ابو کے سخت حکم کی وجہ سے کسی نے بھی اس دیوار کو نہ چھیڑا۔ بعد کو جب یہ مکان کسی اور کو بیچا گیا تو یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اس دیوار کو توڑا تو اندر سے گرہتی کا پورا سلمان برآمد ہوا۔ شلڈ کسی کے جہیز کے لیے رکھا گیا تھا۔۔۔ اور نہ جانے اس سلمان کے علاوہ کیا کیا لٹکا ہو جس کا پتہ ہی نہ چل سکا۔۔۔ ہجرت کے زمانے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں۔

اس طرح کا ایک واقعہ جنگ اخبار کے کالم "ناقابل فراموش" میں بھی چھپا تھا۔ ایک مسلمان خاندان

بھارت سے ہجرت کر کے آیا تو اس خاندان کو کراچی میں کوئی فلیٹ الاٹ ہوا۔ وہ اس میں رہنے لگے۔ ایک دن کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پتہ چلا کہ کوئی اجنبی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستان سے آیا ہے اور ہجرت سے پہلے اسی فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ہندو ہے۔ دو تین دن فلیٹ میں آتا رہا۔ پھر ایک دن اس نے راز دارانہ انداز میں کہا کہ اس کے پاکستان آنے کا ایک مقصد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ محلے والے اس خاندان کے اخلاق، کردار اور ایمانداری کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اس ہندو نے کہا کہ یہ سب کچھ معلوم کرنے کے بعد اسے امید واثق ہے کہ مقصد میں کامیابی ہو جائے گی۔ اس تمہید کے بعد اس ہندو نے کہا کہ ہمارے کے وقت جب وہ ہندوستان جا رہا تھا تو اس کے پاس بہت سا سونا تھا لیکن اس وقت کے حالات میں اسے لے جانا بہت دشوار تھا۔ آخر اس ہندو کو ایک ہی حل سمجھ میں آیا کہ سونا اسی فلیٹ میں چھوڑ دیا جائے اور بعد میں حالات صحیح ہو جائیں تو لے جائے۔ اس ہندو نے سونے کو باریک سی تار میں تبدیل کیا اور گھر کی چھت اور دیواروں میں بچھی ہوئی بجلی کی تاروں کے ساتھ ساتھ یہ سونے کی تار بھی بچھادی۔ اس ہندو نے کہا کہ اب اسکی بہن یا بیٹی کی شادی ہے اور وہ اس امید پر پاکستان آیا ہے کہ اسے اپنا سونا مل جائے گا

پاکستانی نے بغیر کسی تردد کے کہا "مجھے تو اس کا علم نہیں لیکن جناب یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ بلا کسی تاہل کے اپنی امانت لے جا سکتے ہیں"

ہندوستان سے آئے ہوئے فرد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ تو سوچ کر آیا تھا کہ سنے مالک مکان کو اس میں سے نصف حصہ دے دے گا لیکن یہاں تو ایسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ خیر قصہ مختصر سابق مالک نے پوری رات لگا کر بجلی کی تاروں کے ساتھ لگا ہوا اپنا سونا نکال لیا۔ اس نے سنے مالک مکان کو ایک بار پھر اپنی پیش کش دہرائی لیکن پاکستانی کا کہنا تھا کہ وہ شے جس کا مکان سے کسی طرح کا تعلق ہی نہیں بنتا وہ کیسے لے سکتا ہے۔

قصہ مختصر ہندوستانی باشندے نے سونے کی تاریں لیں۔ اس نے جانے کیا انتظام کئے تھے کہ بحیریت اپنے ملک چلا گیا۔ وہاں جا کر بحیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی۔ دو مہینے بعد اس کی طرف سے شادی کا رڈ بھی آیا جس میں اس پورے پاکستانی خاندان کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

ناقابل فراموش میں شائع شدہ کہانی سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ غالباً 1960 یا 1961 کا قصہ ہے۔ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ جب وہ مشرقی پنجاب یا بھارت کے دیگر علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور الاٹ شدہ مکان میں داخل ہوئے تو ایسے لگتا تھا کہ اصل مکین کہیں نزدیک ہی گئے ہیں۔ جانے والے ہندوؤں کو کامل یقین تھا کہ واپس اپنے گھروں میں آئیں گے

- قرہ العین حیدر اپنی کتاب ”روشنی کی رفتار“ صفحہ 116 پر لکھتی ہیں کہ جب اسپین سے مسلمان نکل کر مراکش پہنچ رہے تھے تو وہ اپنے اندلی گھر کی چابیاں مراکش میں دیواروں پر ٹانگ دی تھیں انہیں امید تھی کہ واپسی ہوگی۔

§§§

---



# اپریل فول ، جھوٹ کا عالمی دن !

مصنف: یوسف

یکم اپریل کو جھوٹ کا دن منانے کے بارے میں مختلف قسم کے واقعات ملتے ہیں، جس سے علم ہوتا ہے کہ اس کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اپریل لاطینی زبان کے لفظ اپریلس یا اپراز سے ماخوذ ہے۔ مطلب ہے پھولوں کا کھلنا، قدیم رومی قوم موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی یا دیوی کی پرستش کرتی اور اسے خوش کرنے کے لئے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے، ترنگ میں آتے اور جھوٹ بولتے۔ آگے چل کر یہ دن اپریل فول کہلایا۔ اپریل فول 1508ء سے 1539ء تک صرف یورپ میں منایا جاتا تھا اور اٹھارویں صدی میں برطانیہ میں منانے لگے اور اب چند سالوں سے پوری دنیا میں جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔



اپریل فول کا تذکرہ سب سے پہلے ایک انگریزی اخبار ڈریک نیوز لیٹر سے ملتا ہے یکم اپریل 1846ء کو اپریل فول کے موقع پر یورپ میں جو واقعات رونما ہوئے ان میں سے ایک اہم اور مشہور واقعہ یہ ہے کہ 31 مارچ کو ایک انگریزی اخبار میں یہ خبر آئی کہ کل شہر کے زراعتی فارم پر گدھوں کی عام نمائش ہوگی اور میلہ ہو گا تو لوگ خوش و خرم وہاں جمع ہوئے اور نمائش کا انتظار کرنے لگے۔ جب لوگ انتظار کر کر کے تھک گئے تو پوچھنے پر بتایا گیا کہ جو لوگ نمائش دیکھنے آئے ہیں وہی گدھے ہیں۔ ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کو ہر سال 2 اپریل کی اخبارات میں دیکھا جا سکتا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس دن جھوٹ بول کر کیسے لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ اگر اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو اپریل فول منانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات میں جھوٹ بولنا بہت بڑا گناہ ہے، جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہے، یہ منافقت کی نشانی ہے، اور

اپریل فول میں تو ایک تو جھوٹ بولا جاتا ہے اوپر سے اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے۔ اس کی خوشی منائی جاتی ہے۔ اس رسم اپریل فول میں جھوٹ بولا جاتا ہے دوسروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے، دھوکہ دیا جاتا ہے، غیر مسلموں کی مشابہت اختیار کی جاتی ہے، تکبر کیا جاتا ہے۔ جھوٹ بول کر دوسروں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ سچ بولنا نیکی ہے اور نیکی جنت لے جاتی ہے اور جھوٹ بولنا گناہ ہے اور گناہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔

دوسری حدیث میں ہے جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے۔ تیسری حدیث میں ہے کہ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر حرام ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کے شراغیز ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی مسلمان بھائی کو حقیر جان لے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے وہ اس پر ظلم نہیں ڈھاتا وہ اسے رسوا نہیں کرتا اور نہ وہ اسے حقیر جانتا ہے۔ اور یہ سب برائیاں ایک اپریل فول منانے میں موجود ہیں۔

اس دن کو منانے سے دشمنان اسلام کی خوشیوں میں شرکت کا گمان ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر انسان گناہ کبیرہ یعنی جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اب رہ گئی پاکستان معاشرے کی بات کہ اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ مختصر یہ کہ خوشی کے لیے، حالانکہ جھوٹ بول کر خوشی منانے کا کیا جواز ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں جھوٹ بول کر ہی خوشی منائی جاتی ہے، روزی روٹی کمائی جاتی ہے، کاروبار کیے جاتے ہیں سیاست و صحافت چمکانی جاتی ہے۔ دوسروں کو بے وقوف بنا کر ہم لذت حاصل کرتے ہیں، خوشی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بھی کہنا ہے کہ جھوٹ بولنا اب ہمارے معاشرے میں گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ صادق ﷺ کے ایک فرمان کا مفہوم ہے کہ مسلمان گناہ گار ہو سکتا ہے لیکن وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ہمارے سیاست دان روز بہ روز جھوٹ بولتے ہیں یعنی روز ہمارے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں۔



اسی طرح ہمارے صحافی بھائی، انکر پرسن، کالم نویس، بھی ہر روز ہم عوام کے ساتھ اپریل فول مناتے ہیں، اس کو چھوڑیں عوام بھی جہاں جہاں بس چلتا ہے ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول مناتی ہے، عام آدمی بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ اب مجھے یاد نہیں ہے لیکن کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ پاکستان میں سب سے زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔



جس نے یہ روپورٹ لکھی تھی اسے شاید علم نہیں تھا کہ پاکستانی جھوٹ بول کر خوش بھی ہوتے ہیں اس لیے پاکستانیوں کے لیے تو ہر دن ہی اپریل فول ہے۔ دو نمبر مال دے کر، زیادہ پیسے لے کر، ملاوٹ والی چیزیں بیچ کر، جھوٹے مقدمات بنا کر، ایک دوسرے سے ہر روز اپریل فول ہی مناتے ہیں۔

اس لیے یہ دن ان کو منانا چاہیے جہاں جھوٹ نہیں بولا جاتا چلو ایک دن جھوٹ بول کر دل پشوری کر لیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ جن کی نقل میں ہم اپریل فول مناتے ہیں وہ کم جھوٹ بولتے ہیں۔ پاکستان میں تو اس دن کو منانا اس دن کی تو بین ہے۔ کیونکہ یہاں تو ہر روز منایا جاتا ہے، سب سے منایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب خصوصاً اہل یورپ افراط معاشرہ کے ساتھ عملی مذاق اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کی غرض سے ایک مخصوص دن میں یہ تہوار مناتے ہیں۔ جھوٹ کے دن پورا بیچ! یہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر روز یہ دن منایا جاتا ہے۔

ہم بات کر رہے تھے کہ پاکستانی معاشرے کی کہ اس میں اس جھوٹ کے عالمی دن کو کیوں منایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اوپر لکھی ہے عارضی خوشی حاصل کرنے کے لیے اس کے علاوہ دوسروں کو حقیر جانا بھی اس کی ایک وجہ ہے۔ اپریل فول میں ایسے کام کیے جاتے ہیں جن میں انہیں حقیر جانا گیا ہے بلکہ انہیں حقیر سمجھنا ہی ان سے مذاق کرنے پر ابھارتا ہے لوگوں کو احق قرار دینا۔ ہم خود دوسروں سے اعلیٰ خیال کرتے ہیں۔

اس خامی سے کم ہی بچے ہوں گے ہمارے سیاست دان، صحافت، اور عام آدمی بھی دوسروں کو گھٹیا ہی خیال کرتا ہے جیسے جھوٹ نے ہمارے معاشروں کو برباد کر دیا ہے ایسے ہی تکبر ہے اور اس رسم اپریل فول میں یہ دونوں برائیاں پائی جاتی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ اپریل فول منانے کی وہاں دیگر بہت سی دباؤں کی طرح پھیلتی جا رہی ہے ہمارے نوجوانوں کی اکثریت اسے بغیر سوچے سمجھے قبول کر رہی ہے، اس کی ایک وجہ مغرب کی پیروی بھی ہے کیونکہ ہمارے نوجوانوں کی اکثریت

مغرب سے متاثر ہے، ہمارے نوجوان خود کو جدت پسند کہلانے کے لیے بھی یہ دن منا رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے نوجوان سچین میں مسلمانوں کے قتل عام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام والے واقعہ کی یاد میں یہ دن نہیں مناتی۔

ہمارے ذرائع ابلاغ سے اگر مناسب طریقے سے عوام کے لیے آگاہی مہم چلائی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان سے اس رسم بد کا خاتمہ نہ کیا جاسکے آخر میں قرآن پاک کی سورۃ الحجرات کی ایک آیت کا مفہوم۔ اے ایمان والوں کوئی قوم کسی کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ (جن کا مذاق اڑایا جاتا ہے) ان سے بہتر ہوں، نہ عورتیں ہی دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ، نہ کسی کو برے لقب دو اسلام لانے کے بعد فسق بہت ہی برا نام ہے جس نے توبہ نہ کی وہی ظالم لوگ ہیں۔

§§§

شپ اہم ہیں۔ شہر کے قابل دید مقامات میں ایئر پورٹ، عجائب گھر، پنجاب یونیورسٹی، باغ جناح، شالامار باغ، مینار پاکستان، مال روڈ، انارکلی گلشن اقبال اور ریس کورس پارک شامل ہیں۔ مینار پاکستان کا ڈیزائن ترک ماہر تعمیرات نصر الدین مرآت خان نے تیار کیا۔ تعمیر کا کام میاں عبد القادر ایڈر کمپنی نے 23 مارچ 1960 میں شروع کیا۔ 21 اکتوبر 1968 میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس پر کل لاگت 75 لاکھ روپے آئے۔



بادشاہی مسجد لاہور میں شاہی قلعے کے نزدیک واقع ہے۔ اس مسجد کو مغل بادشاہ شا جہاں نے بنوایا تھا۔ اس میں دو لاکھ کے قریب نمازی نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کے چاروں کونوں میں بہت اونچے مینار ہیں۔ مینار پر چڑھنے کے لیے باقاعدہ لکٹ لینا پڑتا ہے۔ اس مسجد کے درمیان میں بڑا حوض ہے۔

مسجد میں تین بڑے سنگ مرمر کے گنبد ہیں۔ ان پر مینا کاری اور گل کاری کی ہوئی ہے۔ جسے دیکھ کر مغلیہ راج کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مسجد میں داخل ہونے کے لیے پچاس سیڑھیاں چڑھنی پڑتی ہیں۔ یہاں لوگوں کی بڑی تعداد جمعہ اور عیدین ادا کرتے ہیں جبکہ پانچوں نمازوں میں بھی بہت رش دیکھنے میں آتا ہے۔



## لاہور ایک قدیم شہر

مصنف: یوسف

تحریک پاکستان کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے۔ جتنی خود مسلمانوں کی۔ اس لیے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر حاصل کیا گیا۔ دو قومی نظریے کی بنیاد ہندوستان میں اس دن پڑ گئی تھی۔ جس دن ساحل مالا بار کی ریاست گدنگا نور کے حکمران راجہ سامری نے اسلام قبول کیا تھا۔ رفتہ رفتہ دین اسلام کی شواہیں پھیلتی گئیں۔ محمد بن قاسم نے 712 میں سندھ فتح کر کے اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اسلامی حکومت کے قیام سے انگریز حکومت تک مختلف مسلمان خاندانوں کی حکمرانی میں برصغیر میں اسلامی حکومت قائم رہی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس کے نااہل جانشینوں کے باعث برطانوی حکومت نے اسلامی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ہندوؤں نے گٹھ جوڑ کرتے ہوئے اسلامی دشمنی کے سبب وسیع پیمانے پر مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان کرانے کی بھرپور کوشش کی۔

1938 میں سندھ مسلم لیگ کی اکثریت کے ساتھ آزاد ملک کے حق میں باقاعدہ ایک قرارداد منظور کی اور 23 مارچ 1940 کو مسلم لیگ کے 27 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔



لاہور صوبہ پنجاب پاکستان کا دار الحکومت اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے۔ اسے پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ یہ شہر دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں مغل دور کی یادگار ہیں۔ لاہور کو پہلے عروس البلد لاہور بھی کہتے تھے اور یہ علاقہ ملتان کی عظیم سلطنت کا حصہ ہوتا تھا۔

لاہور کی مغلیہ دور میں بھی اپنی ایک حیثیت رہی ہے۔ بابر پہلے سے ہی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دولت خان لودھی کی دعوت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لاہور کے قریب بابر اور ابراہیم لودھی کی افواج کا پہلا ٹکراؤ ہوا۔ جس میں بابر فتح یاب ہوا۔ لیکن جب اسے دولت خان کی سازش کی اطلاع ملی۔ جس پر وہ اپنا ارادہ ختم کر کے لاہور کی جانب بڑھا۔

اس شہر میں کئی بزرگوں اور صوفیائے کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخش، حضرت میاں میر، مہدی اللہ حسین، حضرت شاہ ابوالعانی، حضرت موح دریا بخاری، حضرت گھوڑے شاہ، حضرت شاہ جمال، حضرت شاہ محمد غوث اور حضرت میاں وڈھا شامل ہیں۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیوں اور عمارات سے آراستہ ہے۔ ان میں ماڈل ٹاؤن، گلبرگ، ڈیفنس، سبزہ زار گرین ٹاؤن اور ٹاؤن

## مرد ڈے

مصنف: یوسف

گفتگو نے حیران کردیا وہاں ان کی لاجواب یادداشت نے میرے دل و دماغ کے کئی چراغ روشن کردیئے۔ میں جتنی دیر پاکستان میں رہتا ہوں ان سے جی بھر کر باتیں کرتا ہوں، ان کی ڈھیر ساری باتیں سنتا ہوں جو وہ سارا سال میرے لئے جمع کر کے رکھی ہوتی ہیں۔ میں جب ٹیلیفون پر ان کو سلام کرتا ہوں تو ان کی خوش کلامی سے میرا دل معطر ہو کے رہ جاتا ہے لیکن مختصر سی بات کر کے یہ کہہ کر ختم کر دیتی ہیں کہ تمہیں خواہ مخواہ اس کا زیادہ بل آئے گا۔ آؤ گے تو خوب باتیں کریں گے۔

پانچ سال پہلے انہی دنوں میں پاکستان میں تھا۔ آہستہ آہستہ سورج چڑھنے لگا، بجلی نہیں تھی تو گرمی بڑھنے لگی اور پھر سارا محلہ وقت سے پہلے ہی جاگ اٹھا۔ مٹھے بیٹے نے اٹتے ہی آواز لگائی: "مما آئی لو یو"۔ تب سب سے چھوٹے کی آواز آئی، بھائی میں آپ سے جیت گیا۔ میں نے ماما کو سب سے پہلے "وش" کیا۔ تم تو اپنے نمبر بڑھاتے رہتے ہو اور پھر دونوں میں تھوڑی دیر تکرا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا تو میں نے پوچھا آج ایسا کون سا خاص دن ہے؟ پایا! آج مرد ڈے ہے، چھوٹے نے آواز لگائی۔ تب مجھے معلوم ہوا پھر اس پر بحث ہونے لگی کہ کون سا بچہ اچھا ہے۔ کیا نتیجہ نکال مجھے نہیں معلوم۔

میں کچھ دیر تک تو سوچتا رہا اور پھر خود بخود میرے پاؤں ان کے گھر کی سمت چل پڑے۔ وہ مجھے باہر ہی مل گئیں۔ کبھی ہیں آپ ماں جی..... بہت شرمیلی ہیں وہ، مسکرائیں اور کہنے لگیں تم کیسے ہو؟ آج صبح سویرے ہی..... جی ماں جی آپ کو سلام کرنے آگیا۔

اور ہاں ایک اور بات..... میں آپ کو "وش" کرنے آیا ہوں۔ کس بات کی "وش"؟ انہوں نے پوچھا ماں جی! آج مرد ڈے ہے ناں۔ جیتے رہو میرے بچے، سدا خوش رہو، خوشیاں دیکھو۔ ان کی آواز کا زبردوم میں کیسے تحریر کروں اور ان کے آنسو کیسے صفحہ پر نکھیروں۔ تھوڑی دیر آسمان کی طرف نکلی ہاندھ کر دیکھتی رہیں، بالکل گرم سم۔ آپ ٹھیک تو ہیں ماں جی! میری آواز سن کر چونک سی گئیں اور وہاں اسی دنیا میں لوٹ آئیں۔ اب تو تمہارے سر کے بالوں اور داڑھی میں کافی سپیدی آگئی ہے، کیا تمہارے پوتے پوتیاں تم سے کہانی سننے کی فرمائش کرتے ہیں؟ جی ہاں، کبھی کبھار، مگر نہ آج کل تو اسکول کا بوم ورک اور بعد میں کمپیوٹر پر بچوں کی مصروفیت کے بعد دوستوں سے موبائل فون کی گپ شپ اور ٹیکسٹ پیغامات نے نگہ میں عجیب اجنبیت پیدا کر رکھی ہے، بچوں کے پاس اب بڑوں کے پاس بیٹھنے کی فرصت کہاں؟

تم نے مجھے "مرد ڈے" پر "وش" کر کے ماں جی تومان لیا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ میں تم سے عمر میں کافی بڑی ہوں۔ چلو آج ہم دونوں ایک بھولی بری روائت کو قائم کرتے ہیں۔ کہانی سنو گے؟ انہوں نے اچانک مجھ سے یہ فرمائش کر دی۔ "ضرور، کیوں نہیں، مدت ہوئی مجھے کوئی کہانی سننے ہوئے"۔ انہوں نے ایک کہانی سنائی۔ آپ بھی سنیں:

ایک شخص اپنی ماں کو پھول بھجوانے کا آرڈر دینے کے لیے ایک گل فروش کے پاس پہنچا۔ اس کی ماں دو سو میل کے فاصلے پر رہتی تھی۔ جب وہ اپنی کار سے نیچے اترا تو اس نے دیکھا کہ دکان کے باہر فٹ پاتھ پر ایک نو عمر لڑکی بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ شخص اس لڑکی کے پاس آیا اور اس کے رونے کا سبب پوچھا۔ لڑکی بولی: میں اپنی ماں کے لیے سرخ گلاب خریدنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس صرف پچاس پنس ہیں جبکہ گلاب کی قیمت دو پاؤنڈ ہے۔ یہ سن کر وہ شخص مسکرایا اور اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا، میرے ساتھ اندر چلو میں تمہیں گلاب دلا دیتا ہوں۔ اس نے بچی کو گلاب خرید کر دے دیا اور اپنی ماں کے لیے پھولوں کا آرڈر بک کروا دیا۔ دکان سے باہر آنے کے بعد اس نے لڑکی کو گھر تک پہنچانے کی پیشکش کی۔ یس پلیز! لڑکی نے جواب دیا آپ مجھے میری والدہ کے پاس لے چلیں۔ لڑکی کی رہنمائی میں وہ ایک قبرستان تک پہنچے۔ لڑکی نے وہ سرخ گلاب ایک تازہ بنی ہوئی قبر پر رکھ کر دعا مانگنے لگی۔ وہ شخص پلٹ کر گل فروش کے پاس پہنچا اس نے اپنا آرڈر منسوخ کروایا اور ایک گل دستہ لے کر فوری اپنی ماں سے ملنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

آخری فقرہ کہتے ہوئے ان کی آواز پکپکانے لگی تو میں نے اپنی جھلی گردن اٹھا کر ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو انہوں نے منہ پھیر لیا کہ میں ان کی آنکھوں کی چغلی نے پکڑ لیں۔ سنا ہے تم اخبارات میں لکھتے ہو؟ لگتا ہے جو بچے اپنی ماؤں سے ہزاروں میل دور رہتے ہیں، اب کیا وہ اپنی ماں کی قبر پر سرخ گلاب رکھ کر یہی محبت کا اظہار کریں گے؟ کتنا مشکل ہے اس طرح جینا.....!! "اس سوال

کہیں سے بھی تھکی ہوئی نظر نہیں آتیں وہ۔ ہر دم ہر کام کے لیے کمر بستہ، ہر لمحہ مسکراتی ہوئی، اکثر دکان پر نظر آتی ہیں۔ ایک کاپی ان کے ساتھ سفر میں رہتی ہے جس پر دکاندار سودا سلف دے کر لکھ دیتا ہے اور پھر ہر ماہ پیسے وصول کر لیتا ہے۔ کپڑے مناسب ہی ہوتے ہیں۔ کبھی دبی لینے جا رہی ہیں، صبح سویرے چھوٹے بچوں کو اسکول چھوڑنے جا رہی ہیں، دوپہر میں ان کا بستہ اٹھائے آ رہی ہیں۔ شام کو بچے جب گلی میں کھیلتے ہیں تو وہ ان کی نگرانی کرتی ہیں۔ لڑائی ہو جائے تو بچوں میں صلح کراتی ہیں اور تھانے کیا کیا۔ کبھی ایک بھو کے ساتھ جا رہی ہیں کبھی دوسری کی دولا رہی ہیں۔ ہر دم تازہ دم۔ میں انہیں اکثر ہی دیکھتا ہوں اور چھٹی والے دن تو خاص طور پر۔ اتوار کو صبح سویرے ہر طرف سناہوتا ہے بندہ نہ بندے کی ذات لیکن وہ اللہ کی بندی اس دن کیاریوں سے گھاس پھوس الگ کرتی ہیں، خشک پتے سمیٹتی ہیں، پھر پائپ لگا کر چھڑکاؤ کرتی ہیں۔



اس اتوار کو بھی یہی ہوا۔ میں چھت پر کھڑا نہیں دیکھ رہا تھا اور وہ اپنے کام میں منہمک تھیں۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ کبھی آرام کرتی ہوں گی۔ کبھی کبھی وہ اکیلی بیٹھی آسمان کو تنگتی ہیں۔ بس ایک دفعہ میں نے انہیں اپنی آنکھیں صاف کرتے دیکھا ہے اپنی سفید چادر سے۔ شوہر کا انتقال تو بہت پہلے ہو گیا تھا، پانچ بیٹوں کی ماں ہیں وہ، اور وہ سب کے سب باہر مقیم ہیں۔ شاید وہ بھوکیں ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کا کوئی بیٹا پاکستان آ رہا ہو تب ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ پورے محلے کو بتاتی پھرتی ہیں: وہ کینیڈا والا آ رہا ہے۔ اور پھر وہ دن بھی آ جاتا ہے جب ان کا لخت جگر پہنچتا ہے کچھ دن تک رہتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ ہاں ایک دن اداس تھیں کہ وہ تو آتے ہی اپنے بچوں کو گھمانے پھرانے لگتا ہے، میرا بچہ تو پھر بھی مجھے نہیں ملتا، پھر وہ واپس چلا جاتا ہے اور ماں کی اداسی اور بھی گہری ہو جاتی ہے۔ جن بیٹوں کے بیوی بچے باہر ہیں، وہ تو کئی کئی سال کے بعد اگر آتے ہیں تو ان کے پاس ایک چھوٹی سی ڈائری ضرور ہوتی ہے جس میں پہلے سے لکھا ہوتا ہے کہ پاکستان کے فلاں وقت اسے ہر حال میں اپنی بیوی بچوں کو فون ضرور کرنا ہے، بیوی بچوں کی فرمائشوں کی ایک لمبی فہرست الگ ہوتی ہے جن کی خریداری میں سارا دن بھٹکتے کے بعد جب واپس گھر لوٹتا ہے تو ہر سوس کی منتظر ماں کے سامنے اپنی تھکاوٹ کا اظہار کر کے لینے کی کوئی جگہ ڈھونڈ کر بے خبر سو جاتا ہے اور ماں بار بار سوئے بیٹے کو دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہے..... یہ ہے ان کی زندگی۔

سانہے کہ وہ ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی ہیں، ساری عمر درس و تدریس میں گزار دی۔ اب بھی کئی غریب بچیوں کی کفالت انتہائی پردہ داری اور خاموشی کے ساتھ سرانجام دیتی ہیں۔ مجھے اس بات کا کبھی پتہ نہ چلتا اگر بوڑھا ڈاکا مجھے اس کی اطلاع نہ دیتا۔ ایک دفعہ میں ان کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو مجھے روک کر میرے گل شام کے ٹی وی پروگرام پر تبصرہ فرمانے لگیں۔ مجھے جہاں ان کی علی

کا ہے کوئی جواب آپ کے پاس؟  
اگر نہیں تو پھر جلدی کیجئے کہ ہمارے لئے تو ہر دن "مدرڈے" ہے۔  
نجر کھیت میں جیون کی اک دکھیاری بوڑھی ماں  
بویا نہیں، جو کاٹ رہی ہے

---

§§§

---

